فکر و نظر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام میں حاکمیّت اور جمہوریت کا تصوّر ـــ ایک مذاکرہ

مدیر اعلیٰ کی تقریر ـــ جو ۱۹ رجون ۱۹۷۸ء کو پاکستان نیشنل سنٹر لاہور میں کی گئی ۔ موجودہ صورت میں یہ تقریر نوٹس سے ترتیب دی گئی ہے اس لیے الفاظ کی کمی بیشی اور بعض تفصیلات کی ذمہ داری مرتب پر ہے ۔ (خرم بشیر)

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ۔ اما بعد

صاحب صدر و معزز حاضرین! اس بات سے تو ہم سب بخوبی واقف ہیں کہ پاکستان کی بنیاد کلمہ طیبہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ہے ۔ نیز یہ حقیقت ہے کہ کسی فلاحی ریاست کا دار و مدار اس امر پر ہے کہ وہ کس حد تک فرد کے بنیادی حقوق جان، مال اور عزت کے تحفظ اور معاشرے میں قانونی عدل و مساوات، ضمیر کی آزادی، ترقی کے برابر مواقع اور قدرتی وسائل سے یکساں استفادے کی پاسداری کرتی ہے ۔ گویا ریاست و سیاست کے معاملے میں کسی تصور کی بالاتری کا انحصار زیادہ سے زیادہ انفرادی اصلاح اور اجتماعی فلاح پر ہے چنانچہ اس سلسلہ میں اب تک کی انسانی فکر و نظر کی معراج "نظریہ جمہوریت" کو سمجھا جاتا ہے حتیٰ کہ آج خاک و خون کی ہولی سے بھی جو انقلابات آتے ہیں ان کے قائد سب سے پہلا دعویٰ یہی کرتے ہیں کہ ہمارا مطمح نظر صرف جمہوریت کی بحالی ہے لہٰذا ہمیں پہلے اس امر کا جائزہ لینا ہے کہ متذکرہ بالا اقدار کی ضمانت اس مزعومہ جمہوریت نے کہاں تک مہیا کی ہے اور کیا ہم اس انسانی دریافت پر مطمئن ہو کر ہمہ تن جمہوریت کی استواری کے لیے وقف ہو جائیں یا انسانی فکر و نظر کے مسلسل ارتقاء پر توجہ دیں؛ میں قلتِ وقت کے پیش نظر اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ کس طرح نئی نوع انسان کے مسائل حل کرنے میں انسانی سوچ درماندگی کا شکار ہوئی ہے اور اس بات پر مجبور ہو رہی ہے کہ عقل و تجربہ سے بالاتر رہنمائی "وحی الٰہی" کے سامنے گھٹنے ٹیک دے بلکہ اس وقت جمہوریت کے ہی ایک بہت بڑے علمبردار (BURNS) کے اعتراف پر اکتفا کرتا ہوں ۔

NO ONE DENIES THAT EXISTING REPRESENTATIVE ASSEMBLIES ARE DEFECTIVE, BUT IF AN AUTOMOBILE DOES NOT WORK WELL IT IS FOOLISH TO GO BACK TO FORM CARTS HOWEVER ROMANTIVE.[1]

گویا جمہوریت کے دعویدار بھی اس بات کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ جمہوریت خامیوں سے پُر ہے اور مسئلہ اقتدار کے حصول میں بری طرح ناکام ہو چکی ہے لیکن وہ صرف اس لیے اس کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں کہ ان کی سوچ یہاں آ کر رک گئی ہے اور ان کے سامنے کوئی ایسا نظام نہیں جو کامیابی سے فرد و اجتماع کو "معراجِ حقیقی" سے ہمکنار کر سکے۔

میں اس شکست خوردہ ذہنیت پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم مسلمانوں کے پاس خالق کائنات (رب العالمین) کا دیا ہوا ایک مستقل اور مکمل طرزِ زندگی اور نظامِ حیات موجود ہے جو اس باب میں بھی سب خامیوں سے نہ صرف پاک ہے بلکہ اتنا ترقی یافتہ بھی ہے کہ جہاں انسانی عقل و دانش کی منزل ختم ہوتی ہے وہاں سے بہت آگے اس کی ابتدا ہوتی ہے۔ وہ دینِ اسلام ہے جس کے بارے میں خود اس کا بخشنے والا آج سے چودہ صدیاں قبل یہ اعلان کر رہا ہے۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا[2] (المائدہ ۵:۳)

لیکن مجھے افسوس ہے کہ آج کا مسلمان اپنی غلامانہ ذہنیت کے باوصف غیروں کا اتنا دست نگر ہو گیا ہے کہ اپنے گھر کے لعل و جواہر سے منہ موڑ کر دوسروں کے خذف ریزوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس لیے میں بالخصوص مسلمانوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے گھر کی دولت سے فائدہ اٹھائیے۔ اپنے خزانوں کو ناکافی سمجھتے ہوئے غیروں کے ٹکڑوں کو اپنا بنانے کی کوشش ترک کر دیجیے۔ اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے اس کے ساتھ جمہوریت یا اشتراکیت کا پیوند نہ

---

[1] یعنی کوئی بھی اس سے انکار نہیں کرتا کہ موجودہ نمائندہ اسمبلیاں خامیوں والی ہیں لیکن یہ احمقانہ بات ہو گی اگر ایک خود کار گاڑی اچھا کام نہ کرے تو ہم چھکڑے کو اختیار کر لیں خواہ وہ کیسا ہی دلآویز کیوں نہ ہو۔

[2] آج میں نے تمہاری زندگی کا لائحۂ عمل مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور اسلام کو تمہارے لیے دین پسند کیا ہے۔

لگائیے۔ کوّے کو مور کے پر لگانے سے کوا مور نہیں بن سکتا، دونوں الگ الگ جنسیں ہیں۔[1]

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر　　خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

عموماً غیر اسلامی افکار سے اسلام کو پیوند لگانے کے لیے لفظ اجتہاد کا بڑا سہارا لیا جاتا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس مغالطہ کا ازالہ شروع ہی کر دوں۔ اجتہاد کا مادہ جُہد ہے جس طرح کہ جہاد کا مادہ بھی جہد ہے اجتہاد کتاب وسنت سے خارج کوئی چیز نہیں ہے بلکہ جس طرح کتاب وسنت کی عملاً ترویج کے لیے کشمکش کو جہاد کہتے ہیں اسی طرح کتاب وسنت سے استفادے اور افادے کے لیے ذہنی کوشش کا نام اجتہاد ہے۔ اجتہاد کے معنی قطعاً ایسے نہیں ہیں کہ اسلام میں تغیر و تبدل کے لیے اس کا سہارا لیا جائے۔ اسلام ابدی دین ہے یہ مکمل ہے کہ زمان و مکاں کے لیے آخری رہنمائی ہے اس میں ذہنی کوشش کی ضرورت اس غرض سے ہوتی ہے کہ دیکھا جائے فلاں مسئلہ میں کون سی ہدایت لاگو ہوتی ہے اور درپیش قضیہ میں اسلام کیا فیصلہ دیتا ہے؟ مثلاً اسلام میں چغلی بُری شے ہے لیکن اسلامی تعلیمات ہی میں سے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واقعہ صحیح بخاری میں ہے کہ فاطمہ نامی ایک عورت نے آپ سے مشورہ پوچھا کہ تین آدمی مجھے نکاح کا پیغام دیتے ہیں معاویہؓ، ابوجہمؓ اور اسامہؓ۔ آپ نے فرمایا معاویہ صعلوک (کنگال آدمی) ہے۔ اور ابوالجہم کندھے سے لاٹھی نیچے نہیں رکھتا یعنی سخت گیر ہے البتہ اسامہ اچھا ہے۔ محدثین نے اپنا عظیم الشان علم اسماء الرجال (جس میں راویوں کے حالات سے بحث ہوتی ہے) کی آپ کے متذکرہ بالا مشورے پر بنیاد رکھی ہے۔

انھوں نے اپنے اجتہاد سے یہ سمجھا ہے کہ علم اسماء الرجال میں راویوں کے عیوب بیان کرنے میں راویوں کی کمزوریوں کے پیش نظر لغزشوں سے بچانے کے لیے آپ کا تبصرہ رہنما اصول ہے جو یہاں لاگو ہوتا ہے۔ غیبت والا حکم یہاں نہیں لگتا۔ البتہ ایک چیز واضح کر دوں کہ شریعت کا مقصود خیر و شر اور حق و باطل کی نشاندہی ہے۔ تدبیری امور میں کوئی بندش نہیں ہے۔ ہر زمان و مکان کے لئے اسلام کے قابلِ عمل اور لچکدار رہنے کے یہی معنی ہیں اور یہ چیز زمانہ کی تبدیلی سے بھی متعلق نہیں ہے ایک ہی زمانہ کے مختلف حالات میں مسائل میں احکام کی تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور پھر ہر جگہ بھی

---

[1] DEWEY اپنی تصنیف ETHICS OF DEMOCRACY میں لکھتا ہے۔

یہ کہنا کہ جمہوریت ایک خاص طرزِ حکومت ہے بالکل اسی طرح ہے جیسے یہ کہا جائے کہ مکان صرف اینٹوں کا مجموعہ ہے یا گرجا ایک ایسی عمارت ہے جو کلس اور منبر پر مشتمل ہو صرف اینٹوں کی وجہ سے ہر عمارت کو ایک نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ مسجد اور گرجا میں بہت فرق ہے۔ مرتب)

ایک سی نہیں ہوتی۔ آپ کے زمانہ میں ہی روم و فارس کے حالات حجاز سے مختلف تھے لیکن نبی اکرمؐ نے خود ان کے لیے ہدایات میں تغیر و تبدل نہ کیا۔ آپ صرف عرب کے لیے رسول نہ تھے عرب و عجم کے لیے بلکہ جن و انس کے لیے تھے بلکہ آپ تو رحمۃ للعالمین ہیں۔

لہٰذا تدبیری امور میں آپ نے خود انسانوں کو اپنے تجربات سے بھرپور استفادے کی ترغیب دی ہے۔ تجربات کی آزادی بلکہ غیروں کی تدبیروں اور تجربات میں سے بھی کوئی حکمت کی بات ہو تو اسے اختیار کرنے سے منع نہیں کیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس تجربہ اور ترقی کے نام پر خیر و شر کی بنیادی تعبیر بھی غیر مسلموں سے لی جائے اسی سے مجھے اختلاف ہے۔ عبادات کے علاوہ معاملات میں جس میں شعبہ ریاست و سیاست بھی شامل ہے شریعت کی کوئی متعین تشکل کی پابندی لازم نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بنیادی اصول و ضوابط سے بھی آزادی مل گئی ہے۔ حالانکہ خیر و شر، حق و باطل، عدل و ظلم کا بہت بڑا تعلق ریاست سے بھی ہے۔ اس بارے میں اسلام کی خاموشی کے معنی تو یہ ہوں گے کہ دین ناقص ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حق و باطل اور ظلم و عدل کے بارے میں بنیادی اصول و ضوابط جنھیں آج کل دستور و قانون کا نام دیا جاتا ہے اسلام کی نگاہ میں وہ صرف کتاب و سنت ہیں جو ابدی ہیں جسطرح آج کل دستور و قانون کے تابع قواعد و ضوابط (RULES AND RAGULATIONS) کی اجازت ہر ادارہ کو ہوتی ہے اسی طرح انسانوں کو صرف قواعد و ضوابط (جسے ذیلی قانون سازی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے) کی اجازت ہے اور قرآن کریم کے ارشاد واَمرهم شوریٰ بینهم (الشوریٰ: ۳۸) کا میدان یہی ذیلی قانون سازی ہے۔ میں اسے ذیلی اس لیے کہتا ہوں کہ یہ کتاب و سنت کے تابع ہو گی اور اس کا تعلق زیادہ تر تدبیر و انتظام سے ہو گا اور تقاضے بدلنے سے اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں گی۔ مسلمانوں کے معاملات کے ایسے باہمی غور و فکر سے RULES AND RAGULATIONS وضع کرتے رہیں جو درپیش ضروریات کے مطابق ہنگامی اور وقتی ہوں گے۔ قدیم مجتہدین امت کے اجتہادات میں بھی یہی چیز نمایاں ہے۔ جسے ایک کوتاہ فہم آدمی قانونی اختلاف قرار دیتا ہے حالانکہ اس کا بیشتر حصہ ہر مسئلہ میں درپیش اس پہلو سے ہوتا ہے جسے مجتہد اہمیت دیتے ہوئے ایک حکم (فتویٰ) قرار دیتا ہے تو دوسرا ایک اور پہلو کے پیش نظر الگ حکم لگاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی مشاورتی کونسلیں یا اسمبلیاں یہ کام تو کر

لہ مسلمانوں کے کام باہمی مشورت سے انجام پاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں رسولؐ کا ارشاد، انتم اعلم بامور دنیاکم یعنی تم دنیاوی امور میں زیادہ [illegible]

سکتا ہیں لیکن انھیں قانون سازی کی اجازت نہیں ہے۔

اسلام میں حاکمیت کے تصور کے بارے میں بھی کچھ عرض کر دوں کہ اسلام میں حاکمیت کا تصور جمہوریت سے علیحدہ ہے یعنی اسلام میں جمہور کی حاکمیت کے بجائے اللہ احکم الحاکمین کی حاکمیت تسلیم کی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ ان اللہ ھو الحکم والیہ الحکم (ابوداؤد) اللہ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم چلتا ہے۔

نیز عموماً حاکمیت کے معنی اقتدار اعلیٰ کے لیے جاتے ہیں جس کی مرضی قانون ہوتی ہے۔ لیکن اسلام کی رو سے حاکمیت سے مراد قطعاً اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNTY) نہیں ہے کیونکہ اقتدار اعلیٰ تکوینی امر ہے جو اللہ تعالیٰ کو بلا شائبہ شرکت غیرے حاصل ہے اسی لیے وہ کفار کو بھی تسلیم ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ ولہ اسلم من فی السموت والارض طوعا وکرھا[1] اسی طرح ولہ ما فی السموت والارض کل لہ قانتون[2]۔ ومن یدبر الامر فسیقولون اللہ[3]۔ اس لیے یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جس میں دو رائیں ہوں اس لیے مفکرین اسلام وضاحت کرتے ہیں کہ اصل مسئلہ تشریعی حاکمیت کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں انسان کے اختیار کا معاملہ ہو وہاں اللہ کے فرمان کے مطابق زندگی بسر کرے اسی کے معنی عبادت کے ہیں جو زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے خواہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد۔

اس امر میں اللہ کی مرضی کا مفہوم اس مرضی سے علیحدہ ہے جو تکوینی طور پر سب کو قبول کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوسری قسم کی مشیئت اور خوشنودی کی بنیاد پر ہی اخروی جزا و سزا کا انحصار ہے۔ علمائے اسلام نے دونوں مشیئتوں کے فرق کے لیے دو الگ الگ اصطلاحیں مقرر کی ہیں (۱) توحید ربوبیت (۲) توحید الوہیت۔

انبیاء کی دعوت کا بنیادی نکتہ توحید الوہیت ہی ہے کیونکہ توحید ربوبیت تو تسلیم شدہ امر ہے

[1] سورۃ آل عمران: ۸۳ - زمین و آسمان کے سب انس و جن اور فرشتے خوشی یا ناخوشی سے اسی کے فرمانبردار ہیں یعنی تقدیر الٰہی کے سامنے بے بس ہیں۔

[2] سورۃ الروم: ۲۶ - اللہ ہی کے لیے کل کائنات کی ملکیت و اختیار ہے سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔

[3] سورۃ یونس: ۳۱ - تدبیر کائنات کون کرتا ہے۔ کافر جواب یہی دیں گے اللہ ہی یعنی تخلیق و اختیار میں اللہ کی حاکمیت کفار کو بھی تسلیم ہے۔

اگر کوئی انکار بھی کرتا ہے تو فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ وہ رب کے اقرار پر مجبور رہے ۔ قال سے نہیں تو حال ہی سے !!

حاصل یہ ہے کہ اسلام میں اللہ کی حاکمیت کے اقرار کے معنی یہ ہیں کہ بندے نے اللہ کی اطاعت قبول کر لی اور وہ الٰہ کے سامنے عبد کی حیثیت کا اعلان کرنے کا مکلف ہے ۔ لا الٰہ الا اللہ کے یہی معنی ہیں ۔

؎ یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ اسلام میں اصل چیز عبادت اور اطاعت ہے جسے اللہ کے لیے خالص کرنے کا نام توحید الوہیت اور توحید عبادت ہے ۔ انبیاء اور مشرکین کے درمیان یہی مسئلہ نزاعی رہا کہ جب ربوبیت اور قدرت و اقتدار صرف اللہ کے لیے تسلیم ہے تو جھکنا بھی اسی کے سامنے چاہیے اور فرمانبرداری بھی اسی کی کرنی چاہیے گویا تسلیم شدہ امر توحید ربوبیت کو توحید الوہیت کے اثبات کی دلیل بنایا جاتا ہے ۔ قرآن اسی انداز فکر سے بھرا پڑا ہے ۔ کتاب و سنت میں انبیاء اور امراء کی طرف جو اطاعت کی نسبت ملتی ہے اس سے دھوکا نہ کھانا چاہیے کیونکہ درحقیقت وہ اطاعت یا تو صرف وحی الٰہی کی ہوتی ہے جو انبیاء کی طرف کی جاتی ہے جیسا کہ وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی[1] اور ولو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذنا منہ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین[2] اور ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ[3] میں مذکور ہے یا انتظامی اور تدبیری اجتہادی امور میں جو قانون کی اطاعت میں داخل ہے[4] ۔ کیونکہ اسلام میں راعی اور رعایا کے درمیان اطاعت کا تعلق اس امر سے نہیں کہ کوئی آقا ہو دوسرا غلام بلکہ دونوں نظام کی اطاعت کرتے ہیں اور اس نظام میں دونوں کی الگ الگ حیثیتیں ہیں ۔ ایک لحاظ سے کسی کو اہمیت ہے تو دیگر اعتبار سے دوسرے کو ۔ نظم مملکت میں ہر ایک کے فرائض و حقوق ہیں ۔ نیز واضح رہے کہ اطاعت کے مسئلہ میں نیابت حق کا تصور بھی غیر اسلامی ہے جو غلط طور پر عیسائیت اور عجمی تصوف کی پیداوار ہے ۔ جمہور علمائے امت اسی وجہ سے خلیفۂ وقت کو "خلیفۃ اللہ"

---

[1] سورۃ النجم : ۳، ۴ ۔ آپ اپنی خواہش سے نہیں کہتے وہ تو وحی ہی ہے جو آپ پر کی جاتی ہے ۔

[2] سورۃ الحاقہ : ۴۴، ۴۶ ۔ اگر اپنی طرف کی باتیں ہم پر لگاتے تو ہم دائیں ہاتھ سے آپ کو پکڑ کر آپ کی شاہ رگ کاٹ دیتے ۔

[3] سورۃ النساء : ۸۰ ۔ جس نے رسول کا کہا مانا حقیقت میں اس نے اللہ کی اطاعت کی کیونکہ وہ نمائندہ حق ہے ۔

ہکینے والے آدمی پر فاسق و فاجر ہونے کا فتویٰ لگاتے تھے۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ کا قول معروف ہے۔ لست خلیفۃ اللہ بل انا خلیفۃ رسول اللہ یعنی میں اللہ کا خلیفہ نہیں بلکہ رسول اللہ کا نائب ہوں۔ (الاحکام السلطانیہ للماوردی وغیرہ)

اسلام میں اصل اطاعت کتاب و سنت کی ہے خواہ راعی ہو یا رعایا (حکومت ہو یا شہری) دونوں اس قانونِ الٰہی کے پابند ہیں۔ اس اعتبار سے ان میں باہمی مساوات ہے۔ اگر تدبیری امور میں بھی اختلاف ہو جائے تو حق کا معیار کتاب و سنت ہوں گے کہ تدبیری امور میں عموماً بنیادی فکر ہی کارفرما ہوا کرتا ہے جس کی صحت کا معیار کتاب و سنت ہیں۔[1] قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے۔

وما اختلفتم فیہ من شیء فحکمہ الی اللہ[2] اور فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول[3]

حاکم و محکوم کی اونچ نیچ یا طبقاتی تقسیم اسلام میں نہیں ہے یہ سب چیزیں "تصور اقتدار" کی خرابیاں ہیں۔ جنگ قادسیہ کی فتح کے بعد حضرت عمر بن الخطابؓ کی تقریر اس کی وضاحت کر رہی ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی پوری زندگیاں مساوات اسلامی کی دلیل ہیں۔

---

[1] اس کی وضاحت کے لیے جنگِ بدر کے قیدیوں کے بارے میں صحابہ کی مختلف آراء پر غور فرمائیں کہ بعضوں کی رائے انھیں فدیہ لے کر چھوڑنے کی تھی اور بعضوں کی انھیں قتل کر دینے کی۔ یہ اجتہادی امر تھا اس لیے اختلاف ہو گیا۔ قرآن کریم اور احادیث میں فدیہ کی رائے رکھنے والوں کو ملامت کی گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو وہ عذاب دکھایا گیا جو معافی نہ ملنے کی صورت میں ان کا مقدر ہوتا۔ قرآن کریم نے اس اجتہادی امر کو بنیادی سوچ کی غلطی قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ تریدون عرض الحیوۃ الدنیا واللہ یرید الاخرۃ الایۃ (الانفال: ۶۷) یعنی تم دنیا کے مال و متاع کا ارادہ کرتے ہو جب کہ اللہ آخرت کی بھلائی چاہتے ہیں۔ اسی طرح اجتہادی امور کے لیے اگر بنیادی فکر درست ہو تو اختلاف رائے بھی بُرا نہیں ہوتا۔ حدیث میں ہے کہ غزوہ احزاب کے فوراً بعد آپ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ وہ عصر کی نماز بنو قریظہ میں پڑھیں۔ بعض نے رستہ میں تنگیٔ وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے نماز پڑھ لی کہ رسولؐ کا اصل مقصد صرف جلدی تھا۔ بعض صحابہ نے الفاظ کا دھیان رکھتے ہوئے نماز نہ پڑھی بلکہ منزل مقصود پر جا کر قضا کی۔ رسول اللہ نے دونوں کو درست قرار دیا۔ چونکہ اجتہاد کتاب و سنت کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے اس لیے ہر قسم کے اختلاف و نزاع کے وقت کتاب و سنت کی طرف رجوع کا حکم دیا گیا ہے۔

[2] سورۃ الشوریٰ: ۱۰۔ جس بارے میں تمہارا اختلاف ہو جائے اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔

[3] سورۃ النساء: ۵۹۔ پھر اگر تم مسلمانو! (امراء اور رعایا) کا باہمی نزاع ہو جائے گا تو اپنے معاملہ کو کتاب و سنت سے حل کرو۔

حضرت عمر بن الخطابؓ نے فتح قادسیہ کی خوشخبری سن کر تقریر کی تو آخر میں فرمایا:

بھائیو! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہوں۔ میں تو خود اللہ کا غلام ہوں۔ البتہ خلافت کا کام میرے سپرد ہے اگر میں یہ کام اس طرح انجام دوں کہ تم آرام سے اپنے گھروں میں اطمینان کی زندگی بسر کرو تو یہ میری خوش نصیبی ہے اور اگر خدانخواستہ میری یہ خواہش ہو کہ تم لوگ میرے دروازے پر حاضری دیا کرو تو یہ میری بدبختی ہے۔ میں تمہیں تعلیم دیتا ہوں اور نصیحت کرتا ہوں لیکن صرف قول سے نہیں عمل سے بھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تو اپنے اولین خطبہ میں یہاں تک کہا تھا کہ تم میری اطاعت کرو اگر میں اپنے رب کی اطاعت کروں اور اگر میں اللہ کی اطاعت نہ کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔

رستم نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے نمائندہ حضرت ربعی بن عامر سے سوال کیا کہ جنگ سے تمہارا مقصود کیا ہوتا ہے؟ جواب دیا: اللہ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم انسانوں کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے نکال کر انہیں دنیا کی فراخی و آزادی سے بہرہ ور کریں۔ ادیان و مذاہب کے ظلم و ستم سے نجات دلا کر اسلامی عدل و مساوات سے ہمکنار کریں۔

درحقیقت حقوق ربانی (DEVINE RULE OF KINGDOME) کے تصور سے ماخوذ حکومتِ الٰہیہ کا نعرہ لگا کر انسانی فرد یا معاشرہ کو خلافت (نیابت) کا منصب سونپنا اور اس کی اطاعت کرانا، تھیاکریسی (THEOCRACY) کے مماثل ہے کہ اس صورت میں ایک فرد یا گروہ خدا کی (نیابت) کے دعوے سے قانونی حاکمیت کا حامل بن جاتا ہے اور پھر اپنی اطاعت کو خدا کی اطاعت قرار دیتا ہے، قرآن کریم اس کی تردید ان الفاظ سے کرتا ہے۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ[1] حالانکہ وہ زبان سے رب نہیں بناتے تھے لیکن ان کے احکام کی اطاعت اسی طرح کرتے تھے جیسے اللہ کی کرنی چاہیے۔

بعض حلقوں کی طرف سے جو یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اسلامی قانون نافذ کرو یہ بھی تحصیل حاصل کے مترادف ہے۔ خدا کا قانون ایک مکمل ضابطہ حیات کی صورت میں چودہ صدیاں قبل سے نافذ ہے۔ ہمارا تعلق اس کی اطاعت سے ہے۔ ہم نے حکومت کو خدا تعالیٰ کی نیابت کے تصور سے خدائی اختیارات دے کر اس کا نفاذ حکومت کی ذمہ داری سمجھ لیا ہے حالانکہ وہ

[1] التوبہ: ۳۱۔ یہود و نصاریٰ نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا رب قرار دے رکھا ہے۔

نافذ ہے[1]۔ حکومت بھی اس کی اسی طرح پابند ہے جیسے ایک عام شہری۔ دونوں میں سے جو اس کی اطاعت نہ کرے وہ باغی ہے۔ البتہ اتنی وضاحت کی ضرورت ہے کہ وہ صرف قانوناً نافذ ہے اور اس کے عملی نفاذ کے لیے جدوجہد کی ضرورت ہے۔ بطورِ مثال ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کتاب و سنت کی حکومت قانوناً (DE - JURE) موجود ہے عملاً (DE - FACTO) نہ ہو تو اس کے لیے ہمیں کوشاں رہنا چاہیے۔

آخر میں میں یہ عرض کردوں کہ اسلام کو قبول کرنے کا تعلق چونکہ انسانوں سے ہے اور انسان کا فرض نہ صرف خود اسلام پر چلنا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اس پر چلنے میں مدد دینا یا دوسرے لفظوں میں امر بالمعروف، نہی عن المنکر کرنا ہے اس لیے مسلمانوں کے تدبیری امور کے جو لوگ امین بنیں ان کے لیے خلافت راشدہ کے نظام سے جو حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ اسلام نے ELEC-TION یا SLECTION کی کوئی واضح شکل متعین نہیں کی۔ لیکن بنیادی طور پر ایسی ہدایات ضرور دی ہیں جن پر عمل کرتے ہوئے صحیح تشکیلِ حکومت ہو سکتی ہے چنانچہ اسلام کی رو سے اساطین حکومت کی صفات یہ ہونی چاہئیں۔

۱۔ تقویٰ ۲۔ مہارت ۳۔ اعتماد

تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ جو شخص مسلمانوں کے امور کا امین بنے وہ صاحب تقویٰ ہو۔ یہ شرط بنیادی ہے

مہارت سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے امور صرف ان لوگوں کو سونپے جائیں جو ان امور کی اچھی طرح سمجھ رکھتے ہوں۔ یہ نہ ہو کہ صرف ہاتھ اٹھانے والے ہوں۔ یہ تو بقولِ اقبال جمہوریت کا خاصہ ہے۔

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اعتماد سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کا باہمی اعتماد بھی ان پر ہو کیونکہ اگر کسی کو عوام کا اعتماد حاصل نہ ہو تو وہ عوام کے دلوں پر حکومت کر سکتا ہے نہ عوام اس سے تعاون کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔

باقی رہا یہ امر کہ ان صفات کے حامل لوگ کیسے آگے آئیں گے تو اس سلسلہ میں گزارش یہ ہے کہ یہ کام مسلمانوں کے اہل حل و عقد کا ہے کہ باہمی مشورت سے اپنے حالات کے مناسب ایسا طریقہ کار اپنائیں کہ ان صفات کے حامل لوگ ان کے امور میں امین بنیں۔ جمہوریت کے بالمقابل جب تک ان اصولوں کی بنیاد پر آج کے دور کے لیے کوئی نظام پیش نہیں کیا جاتا عملاً جمہوریت کی خامیوں سے نجات حاصل نہیں کی جا سکتی اور یہ چیلنج پوری ملتِ اسلامیہ کو ہے۔ میں اسی غور و فکر کی دعوت پر اپنی گزارشات کو ختم کرتا ہوں۔ و اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

---

[1] اگر خدا کا دین نافذ نہ ہو تو ہم نماز، روزہ بھی نہ کریں یہ تو معلوم ہی ہے کہ جیسے نماز روزہ دین ہے اسی طرح معاشرت۔۔